کو بالکل تباہ و برباد کر دیا تھا۔ ہر طرف ویرانی ہی ویرانی اور مایوسی ہی مایوسی نظر آرہی تھی زندگی کے آثار دُور دُور نہ دکھائی دیتے تھے۔ انہی شہروں اور بستیوں میں سے کسی ایک پر اللہ کے ایک مومن بندہ کا گذر ہوا، جس کو اللہ کی دعوت کا کام کرنا تھا۔ اس نے ہر طرف تباہی و بربادی دیکھ کر یہ سوال کر ڈالا کہ بھلا کیسے اللہ ان میں زندگی کی رُوح پھونکے گا اور یہ اُٹھ کھڑے ہوں گے؟

(عام مفسرین کا خیال ہے کہ یہ بادشاہ "بخت نصر" تھا اور یہ اللہ کا بندہ حضرت عزیر علیہ السلام تھے۔ قرآن میں نہ اس کی صراحت ہے اور نہ اس کی ضرورت ہے۔ قرآن کا مقصود نام لیے بغیر بھی حاصل ہے۔) اس سوال کا جواب جس انداز سے دیا گیا ہے اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ سوال کا تعلق ان دو باتوں سے تھا، تاکہ پہلی کے ذریعہ دوسری بات کو سمجھا جائے :۔

(۱) انسانوں کے مرنے اور گلنے سڑنے کے بعد قیامت میں ان کو دوسری زندگی کیونکر حاصل ہوگی!

(۲) ایسی ذلّت و خواری کی موت کے بعد دنیا میں ایمانی و اخلاقی زندگی کیسے پیدا ہوگی اور ان کو ترقی و سربلندی کیوں کر حاصل ہوگی؟

سوال ہمیشہ شکوک و شبہات کی بنا پر نہیں ہوتا ہے (حضرت عزیرؑ سے اس کی توقع بھی نہ تھی)، بلکہ اللہ کی قدرت پر حیرت و تعجب کے اظہار کے لیے بھی ہوتا ہے، تاکہ جواب سے ان لوگوں کو رہنمائی حاصل ہو جو شکوک و شبہات میں مبتلا ہوتے ہیں یا زیادہ وضاحت سے بات کو سمجھنا چاہتے ہیں۔

اللہ کی طرف سے سوال کا جو جواب دیا گیا وہ زبانی سے زیادہ عملی تھا۔ سو سال تک موت طاری رہنا، پھر صحیح و سالم اُٹھ کھڑا ہونا، اسی طرح خراب ہونے والی چیزوں (کھانا اور پانی) کا نہ خراب ہونا اور جو خراب ہوئی ہے (گدھا) اس کے بعض حصّے (ہڈیاں) روک کر اپنی قدرت کے کرشمے دکھانا (ان پر گوشت و پوست چڑھانا) ـــــ یہ سب کچھ یہی دکھانے کے لیے تھا کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے، مرنے کے بعد کی دوسری زندگی ہو یا ذلّت و خواری کی موت کے بعد ترقی و سربلندی کی زندگی ہو۔

سو سال تک موت طاری کرنے کی مدّت غالباً اس لیے تجویز ہوئی کہ اس مدّت میں بنی اسرائیل نے اپنے کو سنبھال لیا تھا اور ہر قسم کی ترقی و سربلندی انہیں حاصل ہوگئی تھی۔ شہر یا بستی سے مراد

© rasailojaraid.com

اگر بیت المقدس ہے (جیسا کہ بعض مفسّرین کا خیال ہے) تو تباہی و بربادی کے بعد اس کی آبادی اور تعمیر و ترقی میں سو برس لگ گئے تھے۔ جس بستی کو دیکھ کر سوال پیدا ہُوا تھا اب اس میں ہر طرف زندگی ہی زندگی تھی۔

۲۔ دوسری آیت کا واقعہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے زمانہ میں ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔ کفر و شرک اور بدعات و خرافات نے پورے معاشرہ کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ کسی طرف نہ حق کی آواز سنائی دیتی اور نہ حق بات قبول کرنے کی استعداد دکھائی دیتی تھی۔ ایسی حالت میں فطری طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ بھلا ان مردہ لوگوں میں ایمانی و اخلاقی زندگی کی روح کیسے پڑے گی اور ان بے جان لوگوں میں دعوت کی کامیابی و فتح یابی کیونکر ہوگی؟ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی تسلّی کے لیے اللہ سے عرض کیا کہ آپ مجھے دکھا دیجئے کہ مردہ کو کیسے زندہ کرتے ہیں؟ تاکہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں کہ جو قدرت مردہ کو زندہ کرتی ہے وہ مردہ قوموں کو بھی زندگی دے گی۔ حضرت ابراہیمؑ سے کہا گیا کہ کیا مُردہ کے زندہ کرنے پر تمہارا ایمان و یقین نہیں ہے؟ عرض کیا بلیشک ایمان و یقین ہے، لیکن آنکھوں کے سامنے زندہ کرنے کا منظر دیکھ کر دل کو قرار آئے گا اور اس مردہ قوم میں دعوت کے ذریعہ زندگی کی روح دوڑانے کی ہمّت ہوگی۔ پھر اللہ نے حکم دیا کہ چار چڑیوں کو لے کر انہیں خوب ہلالو، پھر ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ایک ایک ٹکڑا قریبی پہاڑیوں پر رکھ دو۔ پھر انہیں آواز دے کر بلاؤ، وہ تمہارے پاس دوڑتی ہوئی آجائیں گی۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور چڑیوں کے زندہ ہونے کا منظر دیکھ لیا۔ اس مثال سے ایک طرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ جس طرح اللہ نے ان چڑیوں کو مرنے اور ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے بعد زندہ کیا ہے اسی طرح اللہ مُردہ انسانوں کو زندہ کرے گا۔ اور دوسری طرف یہ دکھانا ہے کہ جس طرح چڑیوں کی تربیت کر کے ان کو اس قدر ہلایا اور مالوس بنایا جاتا ہے کہ مرنے اور ٹکڑے ٹکڑے ہونے کے بعد بلانے سے وہ آواز سن کر آجاتی ہیں، اسی طرح انسانوں کی تربیت کر کے انہیں ہلایا اور مالوس بنایا جاسکتا ہے اور ان میں زندگی کی روح دوڑائی جاسکتی ہے۔ ان سے مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں ہے، دعوت کا کام آخر دم تک کرتے رہنا چاہیئے۔

---

id.com

کاروانِ حدیث (۱۴)
عبدالرشید عراقی

قاضی عیاض مالکی

قاضی عیاض ۴۷۶ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق قریہ سبتہ سے تھا، جو مغرب کا ایک مشہور شہر ہے[1] قاضی عیاض نے جن اساتذہ سے استفادہ کیا، اس کی تفصیل حافظ ذہبی (م ۷۴۸ھ) نے "تذکرۃ الحفاظ" میں درج کی ہے[2] اپنے وطن کے علمائے سے استفادہ کے بعد اندلس تشریف لے گئے اور قرطبہ کے علماء سے اکتسابِ فیض کیا۔ بعد ازاں بلادِ مشرق کا سفر بھی کیا[3]

قاضی عیاض کے حفظ و ضبط، ذکاوت و ذہانت اور فہم و تیقن کا علماءِ کرام نے اعتراف کیا ہے۔ اُن کی غیر معمولی فطانت کا یہ حال تھا کہ ۳۵ سال کی عمر میں قاضی مقرر ہوئے[3] قاضی عیاض کو علمِ حدیث سے خاص شغف تھا اور اس فن میں مکمل مہارت اور درک رکھتے تھے۔ علامہ ابنِ خلکان (م ۶۸۱ھ) لکھتے ہیں کہ:

"حدیث اور علومِ حدیث میں یکتائے روزگار اور امامِ وقت تھے اور حدیثوں کے ضبط و تحریر اور جمع و کتابت پر پوری توجہ مبذول کرتے تھے۔ اس لیے اُن کے پاس روایات و احادیث کا کافی ذخیرہ تھا[4]

حدیث کے علاوہ قاضی عیاض فقہ اور علومِ فقہ میں بھی ممتاز تھے۔ علامہ ابنِ فرحون مالکی (م ۷۹۹ھ) لکھتے ہیں کہ:

"قاضی عیاض تفسیر اور اس کے متعلقہ علوم و فنون کے عالم، مبصر فقیہ اور احکام و شرائع کے بڑے واقف کار تھے، اور اس کے ساتھ بلیغ خطیب بھی تھے"[5]

قاضی عیاض صرف دینی علوم ہی میں ممتاز اور فائق نہ تھے۔ بلکہ نحو، لغت، کلامِ عرب

© rasailojaraid.com

اور انساب کے بھی نامور عالم تھے۔ ابنِ خلکان (م ۶۸۱ھ) نے ان علوم میں ان کو امام العصر قرار دیا ہے[۷]

قاضی عیاض امام مالک بن انس (م ۱۷۹ھ) کے فقہی مذہب سے وابستہ تھے۔ مذہب مالکی کے اصول و فروع پر ان کی گہری نظر تھی اور اس مذہب کی جزئیات کے حافظ تھے[۸]

قاضی عیاض اخلاق و عادات میں بہترین خصائص کے حامل تھے۔ انکسار و تواضع، خوش معاملگی، صبر و ضبط، عفو و تحمل، سخاوت اور فیاضی میں بہت مشہور تھے۔ خشیتِ الٰہی، عملِ صالح میں مداومت اور حق کے معاملہ میں شدت پسندی کے لیے مشہور تھے، اور اس کے ساتھ نہایت متقی، پرہیزگار، عبادت گزار، صحیح العقیدہ اور بدعات سے سخت متنفر تھے[۹]

قاضی عیاض ۳۵ سال کی عمر میں عہدۂ قضاء پر متمکن ہوئے۔ آپ نے محکمۂ قضا کے فرائض نہایت خوش اسلوبی اور ذمہ داری سے انجام دیئے اور جب تک قاضی رہے عدل و انصاف سے سرِ مو انحراف نہیں کیا[۹]

موحدین[ع] کی تحریک کا ظہور ہوا تو قاضی عیاض اس تحریک سے وابستہ ہو گئے۔ ۵۴۳ھ کے انتشار اور طوائف الملوکی کے زمانہ میں ان کو جلاوطن ہو کر مراکش جانا پڑا۔ وہیں ان کا جمادی الاخریٰ ۵۴۴ھ میں انتقال ہوا[۱۰]

ع اس تحریک کے بانی محمد بن تومرت سوس میں پیدا ہوئے۔ یہ نہایت لائق اور عالم و فاضل شخص اور امام غزالی (م ۵۰۵ھ) کے تلامذہ میں سے تھے۔ ۵۱۵ھ میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی دعوت کا آغاز کیا۔ جب ان کا حلقۂ اثر زیادہ وسیع ہوا تو انہوں نے مہدویت کا دعویٰ کر دیا۔ عبد المؤمن کو جو ان کا خاص معتقد اور مرید تھا ۵۲۰ھ میں اپنی وفات سے پہلے اپنا جانشین مقرر کر گئے۔ اس نے اندلس اور بلاد مغرب سے مرابطین کی حکومت کا خاتمہ کر کے ان کو اپنے زیرِ نگیں کر لیا۔ ۶۲۰ھ تک الموحدین کی حکومت ان علاقوں میں رہی (عراقی)

id.com